بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ　　نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ　　وَعَلٰی عَبۡدِہِ الۡمَسِیۡحِ الۡمَوۡعُوۡد

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ کا ترجمان

ماہنامہ

المنار

انٹرنیٹ گزٹ

جلد نمبر : 3　　اگست 2013ء　　شمارہ نمبر : 8

ایڈیٹر : مقصود الحق

نائب ایڈیٹر: مبارک احمد صدیقی　　مینیجر : سید نصیر احمد

المنار ہر ماہ باقاعدگی سے جماعت احمدیہ کی مرکزی ویب سائٹ alislam.org پر upload کر دیا جاتا ہے۔آپ گزشتہ شمارے دیکھنا چاہیں تو Periodicals کے حصّہ میں جا کر ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ المنار کو ہمیشہ آپ کی آراء کا انتظار رہتا ہے۔(ادارہ)

تعلیم الاسلام کالج اولڈ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن برطانیہ
53, Melrose Road, London, SW18 1LX
فون: 020 8877 5510　فیکس: 020 8877 9987
ای میل: ticassociation@gmail.com

قال اللہ تعالیٰ

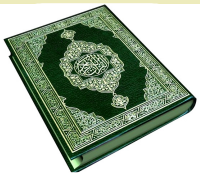

وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: اور تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور نیک باتوں کی تعلیم دے اور بدی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔(آل عمران:105)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جو شخص کسی نیک کام اور ہدایت کی طرف بلاتا ہے اس کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا ثواب اس بات پر عمل کرنے والے کو ملتا ہے اور ان کے ثواب میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوتا، اور جو شخص کسی گمراہی اور برائی کی طرف بلاتا ہے اس کو بھی اسی قدر گناہ ہوتا ہے جس قدر کہ اس برائی کرنے والے کو ہوتا ہے اور اس کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔(مسلم، کتاب العلم)

کلام الامام

ایک مرتبہ میں باہر سیر کو جا رہا تھا، ایک پٹواری عبدالکریم میرے ساتھ تھا، وہ آگے تھا اور میں پیچھے۔راستہ میں ایک بڑھیا کوئی 70 یا 75 برس کی ضعیفہ ملی۔اس نے ایک خط اسے پڑھنے کو کہا مگر اس نے اسے جھڑکیاں دے کر ہٹا دیا۔میرے دل پر چوٹ سی لگی، اس نے وہ خط مجھے دے دیا، میں اس کو لے کر ٹھہر گیا اور اس کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھا دیا۔اسپر اسے سخت شرمندہ ہونا پڑا، کیونکہ ٹھہرنا تو پڑا اور ثواب سے بھی محروم رہا۔

(ملفوظات، جلد چہارم صفحہ 82-83)

ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

اے اللہ تو ہمیں ایسے راستے پر چلا، اس طرح ہماری راہنمائی فرما جو اچھا راستہ بھی ہو، نیکی کی طرف لے جانے والا راستہ بھی ہو اور پھر ہم اس پر چل کر نیکی کو حاصل بھی کر لیں۔صرف راستے کی نشان دہی نہ ہو جائے بلکہ ہم اس پر چلتے رہیں اور نیکی کو حاصل بھی کر لیں اور پھر یہ کہ اپنے مقصود کو یعنی نیکی کو جلدی حاصل کر لیں اور اس کے بعد پھر مزید اگلے رستوں پر چلنا شروع کر دیں۔(از خطبہ جمعہ 13 فروری 2009)

قارئین المنار کی خدمت میں

10 درہم جنہیں خدا نے برکت اور خدمت خلق سے بھر دیا

(ڈاکٹر محمد داؤد مجوکہ)

وہ ایک چھوٹی بھولی بھالی سی لڑکی تھی۔ حالات کے بے رحم تھپیڑوں اور معاشرے کی سنگدل روش نے اُسے اِس چھوٹی عمر میں ہی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ خدا، جس نے سب انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے، اُس نے ہر دوسرے بچے کی طرح اِس کے دل میں بھی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی امنگ اور کھیل کود کا رجحان ودیعت کر رکھا تھا۔

اس کا جسم غلام ضرور تھا مگر اس کی روح تو ابھی تک آزاد تھی۔ جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیل کود میں مصروف ہوتی تو اپنے معصوم جہان کی اکیلی رانی ہوتی۔ تب کچھ لمحات ہی کو سہی، وہ ہر احساس غلامی و تکلیف سے بالا ہو جاتی۔ پھر اچانک کوئی آواز اسے زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف واپس کھینچ لاتی۔ اس کی معصوم سوچ ابھی اُس مقام تک نہ پہنچی تھی جہاں وہ انسانی برابری، غلامی و آزادی کے پیچیدہ سوالات میں الجھ جاتی۔

اس کے مالک کئی دیگر مالکان کے برعکس بہت مہربان واقع ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی ڈانٹ ڈپٹ اور کبھی کبھار مار تک نوبت جا پہنچتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کے مالک ایک نئے دین کو اپنا چکے تھے۔ لڑکی ابھی دین اور عقائد کو سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اس نے یہ محسوس ضرور کر لیا تھا کہ اس کے مالکان اور دوسرے لوگوں کے طرز عمل میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ اس دین کا بانی کون ہے اور اس کی بنیادی تعلیم کیا ہے۔

آج کے بہت ہی مبارک دن سورج اسی طرح مشرق سے طلوع ہوا تھا جیسے ہر روز ہوتا تھا۔ اہل یثرب، جسے اب مدینۃ النبی ﷺ کہا جاتا تھا کے باسی اسی طرح اپنے کاموں میں

مصروف تھے جیسا کہ ہر روز ہوتے تھے۔ لڑکی بھی صبح سویرے سے اپنے مفوضہ کاموں میں مصروف تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ آج اس کے ساتھ کیا واقعہ ہونے والا ہے۔ ایک ایسا واقعہ جو اس کی زندگی تو بدلنے والا تھا ہی لیکن آپ ﷺ کی حسین زندگی کے ایک حسین پہلو کی ادنیٰ سی جھلک دنیا کو دکھا کر ہمیشہ ہمیش کے لئے تاریخ میں محفوظ ہونے والا تھا۔ خدا نے، جس کا علم کامل اور جس کی نظر بے خطا اور دل کی پاتال تک ہے، اس کی کس ادا کو قبول کرتے ہوئے محمد ﷺ کے نور کی ایک کرن کے ظہور کے لئے اس معصوم لڑکی کو ذریعہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ کسقدر خوش نصیب لڑکی بننے والی تھی۔

مگر خدا کی بنائی ہوئی اس رنگا رنگ دنیا میں ایک یہ بھی تو رِیت ہے کہ ہر آسانی سے پہلے کچھ مشکل ہو اور ہر کامیابی سے پہلے کچھ ابتلاء۔ شائد اس لئے کہ تکلیف اور مشکل ہی کے وہ مبارک اوقات ہوتے ہیں جن میں انسان گھبرا کر اور تکلیف و بے بسی کے احساس سے معمور ہو کر شکستہ دل کے ساتھ حقیقی عجز و انکسار کو اختیار کرتا ہے۔ تب وہ رحیم و کریم خدا جو انکساری کو پسند فرماتا ہے اس کے لئے خوشی و سعادت کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ تب اسے اس تنگی کے بعد فراخی اور دکھ کے بعد خوشی دکھا کر شکر گزاری کا ایک نیا موقع فراہم کرتا ہے تا وہ اور بھی ترقی کرے۔ اس لڑکی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہونا مقدر تھا۔

دن چڑھے اس کی مالکن نے اسے اپنے پاس بلایا اور 2 درہم دیتے ہوئے حکم دیا کہ بازار سے ضرورت کی کچھ اشیاء خرید لائے۔ لڑکی پیسے لئے گھر سے خراماں خراماں نکلی۔ اس کا رخ بازار کی جانب جبکہ خیال رستے میں کھیلتے بچوں اور اپنے مختلف کاموں میں مشغول لوگوں کی طرف تھا۔ کبھی وہ ٹک بھر کو رک کر کھیلتی اور کبھی مالکن کا حکم یاد کر کے بازار کی جانب رواں دواں ہو جاتی۔ آخر خدا خدا کر کے وہ بازار پہنچی اور مالکن کے حکم کے مطابق مصروف بازار میں ضروری اشیاء خریدنے لگی۔ دکاندار کو دینے کے لئے جب اس نے پیسے نکالنے چاہے تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ خدایا مالکن کے دیئے ہوئے درہم کہاں گئے؟

وہ کبھی اپنے ہاتھوں کو دیکھتی تو کبھی اپنے دامن کو اور پھر زمین پر اپنے رستے کو۔ مالکن نے پیسے تو ہاتھ میں دئے تھے۔ اور ہاتھ خالی تھے۔ کبھی کبھی وہ دامن میں بھی پیسے باندھ لیا کرتی تھی لیکن آج دامن میں بھی پیسے نہ تھے۔ اب کیا ہوگا؟ پہلے تو اس نے زمین پر پیسے تلاش کئے لیکن مصروف بازار میں گرے پیسے کہاں سے ملتے؟ خدا جانے کہاں گرے اور کہاں کھو گئے؟ اچانک اسے احساس ہوا کہ پیسوں کے بغیر تو سودا ہرگز نہ ملے گا اور سودے کے بغیر گھر جائے گی تو مالکن سودے کی بابت پوچھے گی تو وہ کیا جواب دے گی؟ مالکن پیسے گم کرنے پر ناراض ہو کر ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ پٹائی بھی کرے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس معصوم بچی کا اس شہر میں کوئی بھی نہ تھا ورنہ ضرور وہ اس کی جانب رجوع کا سوچتی۔ اگر اس کی ماں، باپ یا کوئی رشتہ دار وہاں ہوتا تو ان سے مدد کی درخواست کرتی۔ لیکن اس نے ایسا کچھ بھی تو نہ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے معصوم سے ذہن میں یہ خیال ہی نہ آیا ہو۔ آخر مالکن کے ڈر اور پیسے گم ہونے کے افسوس اور اپنی بے بسی کے خیال سے اس کی پیاری پیاری آنکھوں میں موتی ایسے آنسو بھر آئے اور وہ ایک طرف کھڑی ہو کر زار و قطار رونے لگی۔

اُدھر تو یہ واقعہ رونما ہوا اور اِدھر ایک اور ہی دنیا میں ایک جوہر آبدار کی ضوفشانی کا ایک نیا اور حسین منظر منصۂ شہود پر ابھرنے لگا۔ ایک غلام نے اپنے آقا ﷺ کے حضور 10 درہم کا نذرانہ پیش کیا۔ 10 درہم بظاہر ایک معمولی رقم تھی لیکن خدا جانے دینے والے نے کس اخلاص، کس انکسار اور شکر گزاری و وفا کے ساتھ یہ رقم پیش کی کہ خدا نے اسے ایسے قبول فرمایا کہ ہمیشہ ہمیش کے لئے اس کا ذکر امر ہو گیا۔ ہوا یوں کہ آپ ﷺ نے بازار کا قصد فرمایا تا وہاں سے اپنے لئے ایک قمیص خرید فرمائیں۔ بازار پہنچ کر 4 درہم میں ایک قمیص خرید فرما کر چلے تو ایک انصاری بلا تکلف درخواست گزار ہوئے، اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے قمیص پہنائیں خدا آپ کو جنت میں قمیص پہنائے۔ معلوم ہوتا ہے اس انصاری کے پاس پہننے کو قمیص نہ تھی وگرنہ سر بازار ایسا نہ کہتا۔ آپ ﷺ کی جود و سخا کے متعلق اس کے اندازے، جو روز مرہ کے مشاہدہ پر مبنی تھا، کے عین مطابق آپ ﷺ نے فوراً قمیص اسے عنایت فرما دی۔ پھر دوبارہ دکاندار سے 4 درہم کی ایک قمیص خرید فرمائی۔ اب آپ ﷺ کے پاس 2 درہم باقی تھے۔ دکان سے تشریف لے چلے تو رستے میں اس معصوم روتی لڑکی پر توجہ فرمائی۔

کیوں؟ اور لوگ بھی تو تھے جو اسی بازار سے گزرتے تھے انہوں نے تو ایسا نہ کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ آپ ﷺ خدا تعالیٰ کی رضا کی ہر راہ کو تلاش کرنے والے اور ایک مادر مہربان کی طرح اس کی مخلوق کی تکالیف کو خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر دور کرنے والے تھے۔ تب اس رؤف و رحیم نے کمال شفقت سے روتی لڑکی سے پوچھا کہ تم کیوں روتی ہو؟ لڑکی نے سادگی سے جواب دیا اے اللہ کے رسول ﷺ گھر والوں نے کچھ اشیاء خریدنے کو مجھے 2 درہم دئے تھے، وہ گم ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے اسے کوئی نصیحت دھیان دینے اور احتیاط کرنے کی نہ فرمائی اور اپنے آخری 2 درہم فوراً بچی کو دے دئے تا کہ وہ مطلوبہ چیزیں خرید کر گھر کو

جائے۔شاید اس لئے کہ بچی تو پہلے ہی اپنی غلطی کا احساس کر کے شرمندہ وخوف زدہ تھی۔اس وقت اس غلام کو ہمدردی کی ضرورت تھی نہ کہ نصیحت کی۔انسانی فطرت کا یہ نباض اور راز شناس ان امور سے خوب واقف تھا۔اس کے بعد آپ ﷺ تشریف لے چلے۔

لیکن..... لیکن کچھ تو اس دل میں ایسا تھا جو اسے سب سے ممتاز کرتا تھا۔خدا نے اسے یوں ہی تو رحمۃ للعالمین کا خطاب نہیں عطا فرمایا تھا۔کوئی وجہ تو تھی جو اسے مکارم اخلاق پر فائز بتایا گیا تھا۔وہ نیکی کو سنوار کر،خوبصورت وحسین بنا کر اپنے آسمانی آقا کے حضور پیش کرنے کا عادی تھا۔احسان کر کے توجہ پھیر لینا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔احسان پر احسان کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ہر دم اس چشمہ فیوض سے جاری تھا۔پلٹے بھی تو نگاہ بچی پر ہی رہی۔تھوڑا چل کر رکے اور پھر گویا ہوئے کہ 2 درہم تو دے دیئے اب کیوں رو رہی ہو؟ بچی نے جو اپنی پاک و معصوم فطرت کی بنا پر فوراً ہی پہچان گئی تھی کہ یہ ذات ماں سے زیادہ پیار کرنے والی ہے، بے دھڑک عرض کرنے لگی کہ اتنی دیر ہوگئی ہے گھر جاؤں گی تو مار پڑے گی۔فرمایا اچھا چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔ایسا اس لئے نہ تھا کہ آپ ﷺ کے پاس بہت وقت تھا۔خدا خود یہ گواہی دیتا ہے کہ ''دن کو تجھے بہت سے کام ہوتے ہیں''۔پس آپ ﷺ کا بچی کے ساتھ جانا اپنی اہم مصروفیات میں سے وقت کی قربانی دینے سے ہی ممکن ہوا۔

لڑکی کے گھر پہنچ کر حسب معمول سلام کیا۔گھر والوں نے اپنے آقا ﷺ کی آواز پہچان لی اور نہایت ہلکی آواز میں جواب دیا۔اتنی ہلکی کہ آپ تک آواز پہنچ نہ پائے۔آپ ﷺ نے بارِ دگر سلام کیا۔گھر والوں نے پھر وہی روّیہ اختیار کیا۔آپ ﷺ نے تیسری بار سلام کیا۔اب کہ گھر

والوں کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ واپس تشریف لے جائیں گے با آواز بلند انہوں نے سلام کا جواب عرض کیا۔معلوم تو آپ ﷺ کو خوب ہوگا کہ وہ گھر پر ہی ہیں کیونکہ بچی نے ابھی تو بتایا تھا لیکن پھر بھی دریافت فرمایا،شائد ہمیں سمجھانے کے لئے،کہ پہلا سلام تم نے نہ سنا تھا؟ عرض کیا کہ سنا تو خوب تھا لیکن ہم نے چاہا کہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے سلامتی کی دعا بار بار ہم پر پڑھی جاوے۔پھر عرض کیا کہ ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ کیسے تشریف لائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لڑکی اس بات سے ڈرتی ہے کہ تم اسے مارو گے۔انہوں نے عرض کیا کہ ہم اس خوشی میں کہ آپ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اسے خدا کی خاطر آزاد کرتے ہیں۔تب ان کو برکت بخشنے کے بعد آپ ﷺ کی توجہ اس طرف پھری جہاں ہمیشہ لوٹ لوٹ جاتی تھی۔فرمایا اللہ نے 10 درہم میں کتنی برکت دی کہ اس سے اپنے نبی ﷺ کو قمیص پہنائی اور انصار میں سے ایک شخص کو اور ایک گردن کو غلامی سے آزادی بخشی۔خدا ہی کی تعریف ہے جس نے اپنی قدرت سے ہمیں یہ رزق دیا۔اللھم صل علیٰ محمدٍ وعلیٰ آل محمدٍ وبارک وسلم۔ (بشکریہ روزنامہ الفضل ربوہ)

یہ مضمون پڑھ کر آپ کا دل گداز ہوا ہے تو آپ سے درخواست ہے کہ پاکستان کے قابل مگر نادار احمدی طلباء کی مالی امداد کی تحریک میں ضرور حصہ لیں اور اس کارِ خیر میں تاخیر نہ کریں۔اُٹھیں اور ان کی مدد کریں اور دِل کھول کر اس نیک کام میں حصہ لیں۔

TIC OLD STUDENTS ASSOCIATION کے نام چیک لکھ کر صفحہ اوّل پر درج پتہ پر روانہ کر دیں۔یہ کام آج ہی کریں۔کل پر ڈالا تو ایسا نہ ہو کہ رہ جائے۔

جستہ جستہ

نابینا دیکھنے لگیں گے؟
اندھے پن کے علاج میں اہم پیش رفت

مغربی ممالک کی یونیورسٹیاں علوم میں مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں اور تحقیق کی نت نئی چوٹیاں سر کرتی چلی جا رہی ہیں جبکہ تیسری دنیا اور مسلم ممالک کے تعلیمی ادارے ابھی اس دوڑ میں بہت پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔

غفلت تری اے مسلم کب تک چلی جائے گی
یا فرض کو تُو سمجھے یا تجھ سے خدا سمجھے

یونیورسٹی کالج لنڈن کے مورفیلڈ ہاسپٹل کی تحقیقاتی ٹیم نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے نابینا پن کو دور کرنے میں ایک اہم پیش رفت کر کے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔تحقیق کے مطابق آنکھ کے اُس حصے کو سٹیم سَیل کی مدد سے تبدیل کیا جا سکتا ہے جو بصارت کا موجب بنتا ہے۔دیکھنے کے عمل میں ہوتا یوں ہے کہ پردۂ بصارت پر موجود فوٹو ریسیپٹر زنامی خلیے روشنی پڑنے پر متحرک ہوتے اور روشنی کو الیکٹریکل سگنل میں تبدیل کر کے دماغ کو بھیجتے ہیں۔نابینا پن کی صورت میں یہ خلیے مُردہ ہوتے ہیں۔تحقیق کرنے والی ٹیم کے سربراہ پروفیسر روبن علی نے بی بی سی کو بتایا ہے کہ ہم نے پردۂ بصارت بنانے کی نئی تیکنیک دریافت کر لی ہے۔ہم نے ہزاروں سٹیم سَیلز کو اس طرح انگیخت کیا کہ وہ فوٹو ریسیپٹر زخلیوں میں ڈھل گئے، جسے بعد میں آنکھ میں ٹرانسپلانٹ کر دیا گیا۔ان نصب کردہ خلیوں نے آنکھ کے اندر موجود خلیوں سے ہم آہنگ ہو کر کام کرنا شروع کر دیا۔ابھی اس تیکنیک کو مزید بہتر اور مؤثر بنانے کی ضرورت ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ پانچ سال کے اندر انسانی آنکھ پر اس کی آزمائش شروع کی جا سکے گی۔ (بی بی سی اردو سے ماخوذ)

چھوٹے میاں سبحان اللہ!

ابا جان کیا آپ اندھیرے میں لکھ سکتے ہیں؟
ہاں کیوں نہیں، باپ نے جواب دیا
اچھا تو پھر بلب بجھا کر میرے سکول کی تعلیمی رپورٹ پر دستخط کر کے دکھائیں۔بیٹے نے کہا۔

کالی بلی

اگر آپ کہیں جا رہے ہوں اور کالی بلی آپ کے آگے سے گزر جائے تو اس کا کیا مطلب ہے؟
اس کا مطلب ہے کہ کالی بلی بھی کہیں جا رہی ہے!

یقینِ محکم

اخبار کے مالک نے امیدوار سے پوچھا: کیا تمہیں یقین ہے کہ تم یہ اخبار کامیابی سے چلا سکو گے؟

امیدوار فوراً بولا: کیوں نہیں جناب، میں پورے تین سال تک تانگہ اور پانچ سال تک موٹر رکشا کامیابی سے چلا چکا ہوں۔

جدائی کا لمحہ لمحہ

امتیاز احمد راجیکی فلاڈلفیا (امریکہ)

گزشتہ سال پاکستان کے احمدیوں اور خصوصاً ربوہ کے باسیوں کو چوبیس سال بعد سینے سے لگایا تو ان کے سلگتے ہوئے ارمانوں اور سسکتی ہوئی محرومیوں نے پرانے زخم ہرے کر دیئے۔ جلسے کے ایام نے تو خاص طور پر ان مرغانِ بسمل کے کرب انگیز لمحات کی تڑپ کو اور بھی بڑھا دیا۔ امید و حسرت سے یہی شعر ہر دل کی دھڑکن بن گیا۔

وطن سے لندن کو جانے والو، نصیب اپنا جگانے والو
مرے غریب الدیار آقا کو جھک کے میرا سلام کہنا

خلیفۂ وقت سے مکانی دوری نے ان مکینوں کے جگر کیسے کیسے چاک کئے ہوئے ہیں، ان کی معصوم امنگوں اور آرزوؤں کے کس طرح خون کئے ہوئے ہیں، اور جدائی کا لمحہ لمحہ ان کے دلِ حزیں پر کیا کیا چرکے لگائے ہوئے ہے کوئی ان رستے ہوئے ناسوروں، بستہ زدن آہوں، کرب انگیز فغاؤں کی وادیوں سے گزر کر تو دیکھے کتنے ان گنت فدائی ملّت کی خاموش تمناؤں اور موہوم امیدوں کو فراق کی بھینٹ چڑھائے اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے، اور کتنے ابھی تک امید و بیم کی سلگتی بھٹی میں آتش شوق بھڑکائے آرزوؤں کی لو فروزاں کئے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی میزانِ وفا اس کا احاطہ کر سکتا ہے؟

اس دلِ بامگر خونچکاں داستان نے مجھے پھر سے ایک ایسے وجود کی یاد تازہ کرا دی، جو اپنے زخموں کو سینچتے سینچتے امید کی بازی ہار گیا، مگر "جدائی کے لمحے لمحے" کو امر کر گیا۔

جماعت کے بزرگ شعراء اور "تعلیم الاسلام" کے ابتدائی بہی خواہوں میں علامہ سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی ایک نابغۂ روزگار وجود تھے۔ ۱۹۹۶ میں آپ کی وفات پر چند سطریں تحریر کرنے کا موقع ملا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی ہجرت کے ابتدائی دور میں عشاقانِ وفا پر شبِ ہجراں کیسے گزرتی تھی، اس تناظر میں لکھی گئی یہ "داستانِ حرم" اب بھی ویسے ہی غریب و سادہ و رنگین ہے۔

سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی بھی اللہ کو پیارے ہونے والے پیاروں میں شامل ہو گئے۔ شاید آپ کی وفات کا صدمہ میرے لئے ان تمام بزرگوں کی جدائی جیسا ہی ہوتا، جن کے نام سے معمولی سی شناسائی کبھی "الفضل" کے توسط سے ہو گئی تھی اور بس مگر ایک حادثے نے تھوڑے عرصے کے لئے اس نابغۂ روزگار وجود کی صحبت سے فیض پانے کا ایسا موقع فراہم کر دیا کہ باوجود "رہینِ ستم ہائے روزگاری" کے اس ہستی کے خیال سے غافل نہ رہ سکا۔

۱۹۸۵ کے اوائل میں ایک حادثے کے باعث بنک سے کچھ عرصہ بیماری کی رخصت پر رہا۔ واپس کام پر پہنچا تو "صاحبوں" نے "الوداع" کے پروانے سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا، چنیوٹ سے کسی نامعلوم "جزیرے" گوجرہ کے لئے تبادلے کے احکامات آ چکے ہیں۔ بہت سٹپٹایا، کچھ بے سروپا احتجاج کیا، کچھ بے نتیجہ ہاتھ پاؤں مارے؛ مگر کوئی پیش نہ چلی۔ چار و ناچار حکمِ حاکم مرگِ مفاجات رختِ سفر باندھا۔ حد تو یہ تھی کہ گوجرے کا رستہ تک معلوم نہ تھا۔ کبھی چناب ایکسپریس کے سفر کے دوران میں کسی سٹیشن پر اس نام کے بورڈ پر اچٹتی سی نگاہ ضرور پڑی تھی، مگر اس اچانک خبر نے ذہن کی تختی بالکل صاف کر دی۔ مخبوط الحواسی میں کبھی اسے فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نواح میں سمجھنے لگتا، کبھی راولپنڈی کے مضافات میں گوجر خاں آنکھوں کے گرد تارے دکھانے لگتا۔

آخر ایک روز پوچھتا پُچھاتا، بسیں تانگے بدلتا بدلاتا منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں پر بنک کا عملہ اپنے نئے افسر کی آمد کا بڑی بے تابی سے منتظر تھا۔ اوّل تو میرے نام کے بجّے اور تلفظ کرتے کرتے ان کے پسینے چھوٹے ہوئے تھے، اوپر سے میری ہیئت کذائی نے ان کی خوش آئند توقعات کو شدید دھچکا لگایا۔ ابھی وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو پائے تھے کہ میں نے ایک اور دھماکا کر دیا: "چنیوٹ سے ٹرانسفر ہو کر آیا ہوں، ربوہ کا رہنے والا ہوں۔ اور یہاں قریب میں 'مقبول دواخانہ' نامی کسی احمدی دوست کا مطب ہے، ذرا اس کا رستہ تو بتا دیجئے۔"

میں نے سوچا، قسطوں میں تعارف کرانے اور ان کی امیدوں پر آہستہ آہستہ اوس ڈالنے کے بجائے یکبارگی کھل کر سامنے آ جانا بہتر ہے؛ تاکہ ان کی نفرت اور غیض و غضب کی پٹاریوں میں جو جو سانپ پنپ رہے ہیں، نکل باہر آئیں۔ اور اگر یہاں سے بھی دیس نکالا مقدر ہے، تو پھر دیر کاہے کی۔ میرا یہ اچانک وار بڑا کاری ثابت ہوا۔ اور بقول بابائے اردو حضرت مولانا صلاح الدین مرحوم: "ان کے ذہنوں میں تجسّس کے جو کیڑے کُلبلا رہے تھے، وہ آسودہ تو نہ ہوئے مگر سکتے میں ضرور آ گئے۔" چنانچہ انھوں نے نہ صرف مقبول دواخانے کی طرف رہنمائی کر دی؛ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ وہاں سے چند قدم پر دو گلیاں چھوڑ کر احمدیہ مسجد بھی ہے۔ میں نے انھیں "اللہ تمھارا بھلا کرے" کہا اور پہلے طوفان کے ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ابتداً کچھ عرصہ میں روزانہ قریباً پانچ چھ گھنٹے کا سفر کر کے ربوہ واپس آ جایا کرتا تھا، مگر رفتہ رفتہ دونوں طرف سے برداشت کی حدیں جواب دینے لگیں؛ چنانچہ بنک کے سامنے ایک مختصر سا فلیٹ کرایہ پر لے کر بیوی بچے سمیت مستقلاً وہیں براجمان ہو گیا۔ اس دوران میں اردگرد تعارف اور رسم و راہ کے سلسلے چل نکلے۔ معلوم ہوا کہ میرا عزیز دوست طارق جاوید یہیں پر مربّیٔ سلسلہ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اور قرب و جوار میں احمدیت کی کئی ننھی ننھی کونپلیں بہار دکھا رہی ہیں اور شدید تھپیڑوں کے آگے بڑی استقامت اور مستقل مزاجی سے سینہ سپر ہیں۔ دوسری طرف بنک والوں کی خشمگیں نگاہوں میں کچھ مانوسیت یا برداشت کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اور فضا میں کسی بڑے طوفان کی آمد سے پہلے والا سکوت قائم ہونے لگا۔ یہ ابتدا تھی اس بستی میں مختصر سے ہنگامہ خیز قیام کی، جو میرے لئے کئی رنگ میں سنگِ میل ثابت ہوا مگر یہاں کچھ چیزیں میرے اندازے اور تصور سے بالاتر تھیں۔ میرے نزدیک گوجرہ آڑھتیوں کی ایک منڈی تھی، جس میں بڑی بڑی توند والے سیٹھوں، رسہ گیر زمیندار و ڈیروں اور محنت کش مزدوروں اور کسانوں کے علاوہ کسی شے کا پایا جانا محال تھا۔ میرے وہم و گمان کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مقام علم و ادب، حسن و لطافت اور ذوقِ سلیم سے بھی کوئی علاقہ رکھ سکتا ہے۔ مگر کچھ ہی عرصہ میں یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس مشہور زمانہ آڑھتیوں کے شہر گوجرہ کی گُدڑیوں میں شعر و سخن اور علم و معرفت کے نادر الوجود لعل چھپے ہوئے ہیں۔ بھانت بھانت کے خرید و فروخت کے شور و شر اور اناج سبزی کی نیلامی کی بولیوں کے بیچ بیچ کچھ بہت ہی حسین جذبات کے نغمے، کچھ بہت ہی نازک احساسات کے ترانے ہلکے ہلکے مدھم مگر واضح سُروں میں اپنی لے قائم کئے ہوئے ہیں۔ باوجود شعر و سخن کے اعلیٰ ذوق سے عاری ہونے کے یہ لے انجانے میں مجھے اپنانے لگی۔ ایک بے کیف یگانگت اور قربت کے احساس سے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ تب محسوس ہوا کہ اس بستی میں کچھ بہت ہی محبت کرنے والی، کچھ بہت ہی گریہ کرنے والی ہستیاں ہیں؛ جن کی اپنائیت پھولوں کی خوشبو کی طرح ہے، جسے لاکھ کوشش کریں پابندِ سلاسل نہیں کر سکتے۔ کوئی اس تک پہنچ پائے نہ پائے، وہ خود ان تک پہنچ جائے گی۔

ان بزرگ ہستیوں میں ایک بہت ہی ہر دلعزیز شخصیت مکرم و محترم سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی صاحب کی تھی۔ نہایت سادہ، درویش مزاج منفرد شخصیت۔ اپنی جسمانی ساخت اور کمزوری کے باوجود انتہائی حوصلے، تدبّر اور ہمدردی کی حامل ہستی۔ ایک شفیق استاد اور لائبریرین کی حیثیت سے آپ نے طویل عرصے تک اہلِ گوجرہ کی بے مثل خدمت کی۔ باوجود مذہبی اختلاف اور علاقے میں پائے جانے والے عمومی بغض و عناد کے گوجرہ کے تمام طبقات میں آپ کو بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شخصیت کا یہ پہلو افاضۂ خاص و عام تھا اور ہر کس و ناکس کے لئے یکساں و اگر ایک رخ "اپنوں" کے لئے تھا، اور ذرا قریب ہونے پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہستی کتنی نرم، کتنی ہمدرد، کتنی مہربان اور کتنی شفیق ہے۔

یہ دور پاکستان کے احمدیوں کے لئے بڑا کٹھن تھا۔ اسے ایک ناکام اور بے بس دشمن کے دانت پیسنے اور انتقاماً ہر شے کو تہس نہس کر دینے سے مماثلت دی جا سکتی ہے۔ احمدیہ مساجد کو مسمار کرنے، آگیں لگانے، کلمہ مٹانے اور معصوم شہریوں کو مقدمات اور حوالات کی سختیوں سے دوچار کرنا روزمرہ کا معمول تھا۔ گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی جماعت احمدیہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ مربّیٔ ضلع اور قائد خدام الاحمدیہ یہیں رہتے تھے۔ اور امیر ضلع محترم چوہدری قادر صاحب بھی قریبی گاؤں جلیانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس لحاظ سے یہ مقام جماعتی سرگرمیوں کا مرکز تھا؛ گویا علاقے میں ہونے والے

ہر واقعے، ہر سختی، ہر دکھ کا درد یہاں کے باسیوں کو سہنا پڑتا۔ انھیں دنوں ٹوبہ ٹیک سنگھ، گوجرہ اور گردو نواح کے کئی دیہات کی مساجد کو جلانے، مسمار کرنے اور کلمہ مٹانے کی وارداتیں ہوتی رہتیں، اور الٹے مقدمات احمدیوں پر بنائے جاتے۔ اکثر انھیں قید و بند کی صعوبتوں اور طویل مقدمہ بازی کی اذیتوں سے گزرنا پڑتا۔ ظلم کی انتہا ملاحظہ ہو، ایک گیارہ سالہ معصوم بچے پر جھوٹی گواہیوں کی بنا پر کلامِ الٰہی جلانے کا انتہائی ظالمانہ مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

کرب و بلا کے اس مسلسل اذیتناک دور میں اس چھوٹی سی جمیعت میں غیر معمولی قرابت، تعاون اور رشتۂ اخوت و محبت کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ حسنِ اتفاق سے بوقتِ ضرورت ایک سوزوکی جیپ میرے ہتھے لگ جایا کرتی تھی؛ چنانچہ امیر صاحب ضلع، مربّی صاحب یا قائد صاحب کے ہمراہ ضلع کی مختلف جماعتوں کے دورے کا موقع ملتا رہتا۔ اور ہر بار خوشی کی خبروں سے زیادہ کچھ ایسے تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑتا کہ وجود چور چور ہو جاتا۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا، جسم کچل دیا گیا ہے اور روح ڈھیروں بوجھ تلے دب گئی ہے ایسے میں جو ہستی ہمیشہ ڈھارس، تسلی اور ولولۂ نو کا باعث بنتی وہ سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی صاحب کی شخصیت تھی۔ تھکے ماندے، زخموں سے چور، پژمردہ چہرے لئے حاضر ہوتے اور اس متبسّم اور متبرک وجود سے مسکراہٹیں اور جواں حوصلے لے کر واپس لوٹتے۔ کبھی اپنے دلکش شیریں کلام سے ساری تھکنیں دور کر دیتے، کبھی اسلاف کی قربانیوں کے تذکرے بیان کر کے ولولے تازہ کرتے۔ کبھی صرف خاموشی سے پیغام دیتے کہ ان موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے چھپی ہوئی گہری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، نیلگوں سمندروں میں پوشیدہ کتنے طوفانوں کا پتا دے رہی ہیں؛ پھر بھی سطح پر کیسی پُرسکون ہیں۔ اس سرخ و سپید چہرے پر چھائی ہوئی زردی کی تہوں کو پلٹ کر دیکھو، کیسی کیسی صحرانوردی، کیسی کیسی دشت گردی کی خبر دے رہی ہیں غرض اس دورِ ابتلا میں خدا تعالیٰ نے اس وجود کو رحمت و رأفت کی چٹان بنا دیا، جو اکیلی طوفانوں میں سر اٹھائے ہر دکھ اپنے سینے پر سہہ رہی ہو اور مسلسل رہِ منزل کا نشان بنی ہو۔

کبھی گزرتے گزرتے صدیقی صاحب کا حال پوچھنے ''چراغ منزل'' پر رک جاتا۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور بچوں کی ایسی محبت تھی کہ کسی حالت میں دروازے سے واپس نہ لوٹنے دیتے۔ لازماً اندر بٹھا لیتے اور انتہائی منع کرنے کے باوجود صدیقی صاحب کو اطلاع دے دیتے۔ میری طبیعت پر یہ بات بڑی گراں گزرتی کہ ایک بزرگ شخص بیماری کی حالت میں نہایت تکلیف اٹھا کر دوسری منزل سے نیچے اترے؛ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ ایک بار حاضر ہو جاتا تو زیارت سے محروم رہتا۔ انھیں یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ در پر آئے ہوئے کسی فقیر کو خالی ہاتھ جانے دیتے۔ اگر کوئی محبت کی بولی لے کر آیا ہے تو اس کے کشکول کو اس سے بہتر محبت کی جزا سے بھرے بغیر انھیں چین نہ آتا تھا۔ ان کی یہی محبتیں تھیں جو ہر خاص و عام کو ان کا دیوانہ بنائے رکھتیں وہ بالکل سادہ، بالکل بے ریا، بالکل بے لوث تھیں۔ ان کی تہہ میں ایک بے پایاں عشق پوشیدہ تھا، جس کے منبع میں سچی محبت کا اک چشمۂ رواں موجزن تھا، جو اپنے رنگ میں بے مثل اور بے نظیر تھا اور وہ تھا خلافت سے بے پناہ عشق۔ امامِ وقت سے دیوانہ وار قلبی تعلق اور عقیدت۔

میں نے صدیقی صاحب کے عشقِ خلافت کو بے نظیر کہا ہے۔ کسی مبالغے کی بنا پر نہیں، ایک ٹھوس حقیقت کی بنیاد پر؛ کیونکہ سچا عشق ہمیشہ بے نظیر ہی ہوتا ہے۔ اس کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی دیکھنے والے کی نظر میں وہ کم تر یا برتر ہو سکتا ہے؛ مگر اپنے طور پر، اپنی استعداد میں، اپنی قدرت میں وہ فنا کی انتہا رکھتا ہے۔ فدائیت کی معراج ہوتا ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا دینے کا حوصلہ اور عزم رکھتا ہے۔ سچا عشق چاہے بادشاہ کا ہو یا فقیر کا، ایک برابر ہوتا ہے۔ وہ بادشاہوں سے تخت چھڑانے کا ملکہ رکھتا ہے اور فقیروں کو تخت کا وارث بنانے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

باوجود اپنی علمی کم مائیگی، تفاوتِ عمری اور ذوقِ شعر و سخن سے عاری ہونے کے، میری صدیقی صاحب سے قلبی تعلق کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ تھی اک دردِ مشترک ایک مشترکہ محبوب کی جدائی کا صدمۂ غمِ ہجراں کی کسک، کچھ کھو دینے کا غم، کچھ پا لینے کی حسرت۔

یہ عشق ایسا روگ ہے، چھپائے چھپ نہ پائے ہے | یہ درد ایسا درد ہے، جو بانٹے بڑھتا جائے ہے

اور فی الحقیقت اس عشق کا لطف ہی نرالا ہے۔ اس میں رقابت کا تصور ہی جدا ہے۔ یہاں تو اسی تمنا میں عمر کٹتی ہے کہ میرے محبوب کے چاہنے والے اور بھی ہوں۔ اس کے قدموں میں نچھاور ہونے، اس کی چاہتوں میں شریک ہونے والے اور بھی بڑھیں۔

کوئے جاناں کو رقیبِ ہمنوا کے ہیں قدم اٹھے | میں لوں اس کی بلائیں، خیر ہو اس کی، نہ وہ بھٹکے
تجھے اپنا نہ کیوں سمجھوں، تو ساقی میرے ہمدم کا | تیرے صدقے نہ کیوں جاؤں، تو راکھی میرے بالم کا

یہ وہ دور تھا، جب محبوب آقا کی جدائی کا غم بہت تازہ تھا۔ اس زخم کو کریدنا بھی بھلا لگتا۔ اس کو ہرا رکھنا بھی دل کو بھاتا۔ جتنا وہ رِستا، اتنا ہی گداز بخشتا۔ جتنا وہ چھڑتا، اتنا ہی سوز سے ہمکنار ہوتا اور یہ درد تھا بھی دو آتشہ۔ وہ محبوب جس کی جدائی میں اِک دنیا بے قرار تھی، وہ اپنے پیاروں کی دوری میں ان سے بڑھ کر تڑپ رہا تھا۔ اور بالآخر یہ تڑپ ایک درد بھرے خوبصورت کلام میں ڈھل گئی۔ اُن دنوں حضرت صاحب کی نظم: ''کسی غریب الوطن مسافر کی چاہتوں کا سلام کہنا'' نے ایک جہاں کو تڑپا دیا۔ اس کی نغمگی، اس کی کسک، اس کا سوز گویا ہر دل کی دھڑکن بن گیا۔ کئی احمدی شعرا نے بھی اس درد میں ڈوب کر اسی رنگ میں طبع آزمائی کی۔ سیّد اسمٰعیل صدیقی صاحب نے بھی اس کے جواب میں آقا کی خدمت میں ''تیری جدائی کا لمحہ لمحہ'' نامی نظم بطور ہدیۂ نذر و عقیدت پیش کی۔ مجھے علم نہیں، ان کا یہ کلام منظرِ عام پر آیا یا نہیں؛ مگر میری یہ خوش قسمتی ہے کہ براہِ راست صدیقی صاحب سے اسے سننے کا شرف حاصل ہوا، اور پھر گویا وہ ہمیشہ کے لئے میرے دل کی آواز بن گیا۔ اس کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

وطن سے لندن کو جانے والو! نصیب اپنا جگانے والو! | مرے غریب الدیار آقا کو جھک کے میرا سلام کہنا
سلام کہنا، سلام کہہ کر انھیں بصد احترام کہنا | کہ خوں کے آنسو رلا گیا ہے، ترا وہ شیریں کلام کہنا
وطن میں تیرے بغیر گلشن کی ڈالی ڈالی تڑپ رہی ہے | اداسیوں کے مہیب سائے ہیں چھا رہے صبح و شام کہنا
بڑا اذیت رساں ہے آقا تیری جدائی کا لمحہ لمحہ | ترس رہے ہیں تری زیارت کو میرے آقا عوام کہنا
تمھاری راہوں میں میرے آقا ہماری آنکھیں بچھی ہوئی ہیں | خدا کرے آپ جلد لوٹیں یہاں بصد احتشام کہنا
تری محبت، تری عقیدت کی شمعیں روشن ہیں میرے دل میں | دعا کریں کہ خدا میری چاہتوں کو بخشے دوام کہنا
نہیں مجالِ سخن اگرچہ یہ حوصلہ ہے دلِ حزیں کا | وگرنہ احسنؔ تو ہے فقط تیری جوتیوں کا غلام کہنا

اس کلام کا درد سینے میں سمیٹے میری بے قراریاں بڑھتی گئیں اور بالآخر خدائے کریم و قدوس نے وہ دن دکھایا جب ۱۹۸۹ میں آقا کے قدموں میں حاضر ہو کر انھیں قرار مل گیا۔ محبوب کے سینے سے لپٹ کر گویا صدیوں کی کلفتیں دور ہو گئیں۔ ہزاروں میل مسافت کی تھکنیں اور کوفتیں یکبارگی تمام ہوئیں۔ ہر دکھ، ہر غم بھول گیا۔ ہر کرب راحتِ جاں کے سرور میں بدل گیا۔ ہر درد کیفِ ماضی کا روپ دھار گیا۔ مگر اب سالوں بعد بزرگ صدیقی کی موت نے اس ہلکی سی کسک کو ایک بار پھر نمایاں کر دیا۔ اس معمولی سی چبھن کو واضع کر دیا، جو پھانس کی طرح میرے سینے میں پیوست رہی۔ وہ وجود جس کی صحبت نے عشق کی راہوں میں میرے آتشِ شوق کو بھڑکایا، جس کے کلام نے میرے ذوق و جنوں کو نکھارا۔ جس کی تڑپ اور تمنائیں میرے لئے راہِ منزل بن گئیں۔ جس کے صبر و قرار نے میری بے قراریوں کو اتنا بڑھایا کہ قفس کے بندھنوں کو توڑتا ہوا نُچے ہوئے پروں سمیت دیوانہ وار محوِ پرواز محبوب کے قدموں میں جا گرا۔ خدا جانے اس سبیلِ سفر کی آنکھیں بھی آقا کے دیدار سے ٹھنڈی ہوئیں یا نہیں۔ اس کے سلگتے ہوئے سینے کو بھی محبوب سے لپٹ کر قرار نصیب ہوا کہ نہیں۔

یہ سوچ کر میرے جذبات کی باگیں کھنچ سی گئیں۔ کیف و سرور کے لمحات پھیکے پڑنے لگے۔ جوش و جنوں کی چنگاریاں راکھ کا ڈھیر بننے لگیں۔ اپنی کامیابی پر نازاں ہونے کے بجائے شرمندہ سا ہونے لگا۔ اس خیال نے میرے شوقِ پرواز پر مَنوں بوجھ ڈال دیا منزل کی تلاش میں کتنے کارواں نکلتے ہیں، کتنے مسافر رختِ سفر باندھتے ہیں؟ مگر کتنے مراد پاتے ہیں؟ کچھ گردِ راہ ہو جاتے ہیں، کچھ مہمیزِ سفر بن جاتے ہیں۔ تھوڑے ہی منزل کو پہنچتے ہیں مگر ان پہنچنے والوں کے جلو میں پیچھے رہ جانے والوں کی قربانیوں کی لڑی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

سیّد احسن اسمٰعیل صدیقی صاحب کا وجود بھی قربانیوں کی اسی لڑی کے قیام کی یاد دلاتا رہے گا۔

ذرّوں کی کہانی - آصف کی زبانی

بنیادی طاقتیں (آصف علی پرویز)

دوست: میں نے سنا ہے کہ پروفیسر عبدالسلام صاحب مرحوم کو نوبل انعام دو طاقتوں کے ادغام (Unification) پر ملا تھا۔

آصف: آپ نے بالکل صحیح سنا ہے۔ دراصل چار بنیادی طاقتیں ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اگر کائنات اس کرسی کی مانند ہے تو یہ چار بنیادی طاقتیں اس کی چار ٹانگیں ہیں۔ جس طرح ٹانگوں کے بغیر کرسی پر سے آپ دھڑام سے گر جائیں گے اسی طرح اگر یہ چار بنیادی طاقتیں نہ ہوں تو کائنات پیدا ہی نہ ہوتی۔ اگر خدا تعالیٰ کی تقدیر آج ان چاروں طاقتوں کو ختم کر دے تو کائنات ایک سیکنڈ کے کھربویں حصہ میں تباہ و برباد ہو جائے۔

دوست: لگتا ہے کہ یہ موضوع تو بہت دلچسپی کا ہے۔ آخر میری بقا کا راز انہی چار طاقتوں میں ہے۔ براہ کرم مجھے ان طاقتوں کے بارے میں بتائیں۔

آصف: سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات کے وقت جو سب سے پہلی طاقت پیدا فرمائی وہ **کشش ثقل** (Gravity) ہے۔ بڑے دھماکے (Big Bang) کے پہلے سیکنڈ کے کھربویں بلکہ شاید اس سے کم وقت میں یہ طاقت پیدا کی گئی۔

دوست: کیا یہ وہی طاقت ہے جس سے زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مثلاً جب میں گیند کو آسمان کی طرف پھینکتا ہوں تو وہ زمین کی طرف واپس آ جاتا ہے۔

آصف: آپ نے بالکل صحیح بیان کیا ہے۔ کشش ثقل ہی وہ طاقت ہے جس کی وجہ سے ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ وگرنہ ہم خلابازوں کی طرح اڑتے پھرتے اور لاکھ کوشش کے باوجود پیالی سے چائے ہمارے منہ میں نہ جا سکتی۔ کیونکہ اس طاقت کے بغیر ہر چیز کا وزن صفر ہو جاتا ہے۔

دوست: اس سے تو میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ہمارا موجودہ رہن سہن کا انداز ہی نہ ہو سکتا۔

آصف: ہمارا چلنا، جانوروں کا دوڑنا، پودوں کا پنپنا ناممکن ہو جاتا اور ہوا جس میں ہم سانس لے کر زندہ رہتے ہیں کب کی غائب ہو چکی ہوتی اور یوں نسل انسانی وحیوانی کبھی پروان ہی نہ چڑھ سکتی۔ اس قوت پر نیوٹن (Newton) نے بہت زیادہ تحقیق کی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نیوٹن ایک سیب کے درخت کے نیچے سو رہا تھا کہ اوپر سے ایک سیب گر کر اس کے سر پر لگا۔ وہ اُٹھ کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔

دوست: (قہقہہ لگا کر) یہ بھی کوئی سوچنے والی بات ہے۔ اگر میں نیوٹن کی جگہ ہوتا تو مزے سے سیب کھاتا اور پھر اطمینان سے سو جاتا!

آصف: یہی تو فرق ایک سائنسدان اور آپ میں ہے۔ کئی سالوں کی گہری تحقیق کے بعد اس نے اپنی مشہور کتاب لکھی جس میں اس نے کشش ثقل کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔

دوست: کیا حرکت کے تین مشہور قوانین جو ہم دسویں جماعت میں پڑھا کرتے تھے انکا تعلق بھی کشش ثقل سے ہی ہے؟

آصف: جی ہاں! آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔ بعد میں آنے والے سائنسدانوں نے اس پر بہت تحقیق کی اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ کشش ثقل ہی ہے جو ہمارے شمسی نظام بلکہ تمام کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ **رب العالمین** خدا نے اس طاقت کے ذریعہ کائنات کو دوام بخشا ہے۔ زمین پر کشش ثقل بالکل تھوڑی ہے لیکن اس کا سب سے زبردست اظہار سیاہ سوراخوں (Black Holes) میں ہوتا ہے۔

دوست: ذرا کچھ اندازہ تو بتائیے کہ وہاں یہ طاقت کتنی ہوگی؟

آصف: یوں سمجھیں کہ اگر آپ کے پاؤں Black Holes میں داخل ہو جائیں تو یہ طاقت آپ کے پاؤں کا رواں رواں توڑ کر ایٹموں اور دوسرے ذروں میں بدل دیگی۔

دوست: آپ مجھے کیوں ڈرا رہے ہیں؟

آصف: Black Holes اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان تخلیق ہیں جب آپ اور میں تخلیق کائنات کے سفر پر روانہ ہوں گے تو میں تفصیل سے Black Holes کی اہمیت کے بارے میں بتاؤں گا۔ انشاء اللہ۔

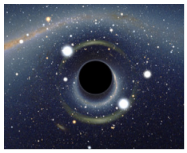

دوست: شکر ہے کہ آپ کے ذروں کی کہانی سے تو جان چھوٹی!

آصف: جی نہیں! سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کشش ثقل کا باعث بھی ایک ذرہ ہی ہے اور اسے Graviton کا نام دیا گیا ہے۔

دوست: اب آپ مجھے دوسری طاقت کے بارے میں بتائیے۔

آصف: دوسری طاقت کا نام **بجلی و مقناطیسی طاقت** (Electromagnetic Force) ہے۔

دوست: اس کا تفصیلی ذکر آپ نے المنار اپریل ۲۰۱۳ء میں ذروں کی کہانی میں کیا تھا اور میں نے بڑے شوق سے اس مضمون کا مطالعہ کیا ہے۔ روشنی بجلی و مقناطیسی لہروں ہی کا نام ہے۔

آصف: آپ نے خوب یاد رکھا ہے۔ خدائے **رحمٰن** نے روشنی پیدا فرما کر ہمارے بسنے کے سامان بنائے ہیں۔ پودے دن کے وقت روشنی کی مدد سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کو بطور خوراک استعمال کرتے ہیں اور آکسیجن پیدا کرتے ہیں۔ اگر رحمٰن خدا نے ایسا انتظام نہ فرمایا ہوتا تو فضا میں اتنی زیادہ کاربن ڈائی آکسائڈ ہو جاتی کہ ہم اپنے ہی سانس میں دم گھٹ کر مر جاتے۔

دوست: بہتر ہے کہ میں آپ سے خود ہی پوچھ لوں کہ اس طاقت کا اظہار کس ذرہ سے ہوتا ہے؟

آصف: روشنی کا ذرہ فوٹان (Photon) اس طاقت کا اظہار کرتا ہے۔

دوست: اب آپ مجھے تیسری طاقت کے بارے میں بتائیے۔

آصف: تیسری طاقت کا نام کمزور طاقت (Weak Force) ہے۔ یہ ایٹم کے اندر مرکز میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت کمزور طاقت ہے اور اس کا دائرہ اثر بھی نہایت ہی محدود ہے۔

دوست: ایسی کمزور طاقت پھر بیچاری کیا کر سکتی ہے؟

آصف: یہ طاقت ایٹم کے اندر سے ریڈیائی شعائیں نکالنے کا باعث ہے جو تین قسم کی ہیں۔ جن کو الفا Alpha، بیٹا Beta اور گیما Gamma ذرات کا نام دیا گیا ہے۔

دوست: انکا کچھ فائدہ بھی تو بتائیے!

آصف: یہ شعائیں ہسپتالوں میں کینسر جیسے موذی مرض کے علاج میں استعمال ہوتی ہیں۔ انسان بعض اوقات اپنی غلطیوں مثلاً کثرت شراب نوشی یا سگریٹ نوشی کے باعث کینسر کا شکار ہوتا ہے تو خدائے **رحیم** نے انہیں شعاؤں میں قوت شفا بخشی ہے۔ یہ شعائیں کینسر زدہ خلیوں کو تو ہلاک کر دیتی ہیں لیکن صحتمند خلیے بالکل ٹھیک رہتے ہیں اور یوں انسان کینسر سے نجات پا سکتا ہے۔

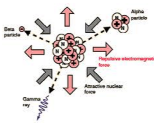

دوست: اس طاقت کو کن ذروں نے اپنی نمائندگی کا شرف بخشا ہے؟

آصف: اس طاقت کا اظہار W اور Z بوسان (W & Z Boson) ذروں سے ہوتا ہے۔

دوست: اچھا تو یہ بتائیں کہ پروفیسر عبدالسلام صاحب نے کن دو طاقتوں کا ادغام (Unification) ثابت کیا ہے؟

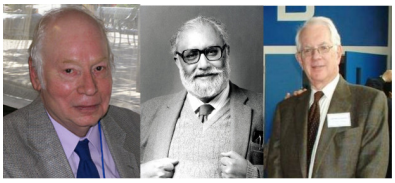

آصف: پروفیسر عبدالسلام صاحب مرحوم نے اپنے دو ساتھیوں شیلڈن گلاشو (Sheldon Glashow) اور سٹیون وائن برگ (Steven Weinberg) کے ہمراہ یہ ثابت کیا کہ کمزور طاقت اور بجلی و مقناطیسی طاقت دراصل ایک ہی ہیں اور ان کا نام انہوں نے بجلی و کمزور طاقت (Electroweak Force) رکھا۔

دوست: ان دونوں طاقتوں کو ایک ثابت کرنے کا کچھ فائدہ بھی ہے؟

آصف: دیکھئے! میں آپ کو بجلی اور مقناطیسی طاقت کو ایک ثابت کرنے کے فائدے بتاتا ہوں۔ جب سکاٹش ریاضی دان جیمز میکسویل (James Maxwell) نے بجلی اور مقناطیسی طاقت کو حسابی رنگ

میں ایک ثابت کیا تو اس وقت تو شاید چند سور یاضی دان ہی ان کی بات کو سمجھ سکے ہوں گے۔ لیکن اس تحقیق کے نتیجہ میں ہی بجلی و مقناطیسی لہریں (Electromagnetic Waves) دریافت ہوئیں تو بے شمار ایجادات ہوئیں۔ مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، سیٹلائٹ، ریڈار، موبائل فون وغیرہ وغیرہ۔

دوست: تو کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد بجلی و کمزور طاقت (Electroweak Force) کی وجہ سے ایسی ایجادات ہوں گی جن کا اس وقت ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

آصف: یقیناً انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا اور یوں پروفیسر عبدالسلام صاحب کا نامِ گرامی سائنس کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

دوست: اب ذرا چوتھی طاقت کے بارے میں کچھ بتائیے؟

آصف: چوتھی طاقت کا نام **زبردست طاقت** (Strong Force) ہے۔ یہ بھی ایٹم کے مرکز میں ہوتی ہے۔

دوست: اچھا یہ بتائیں کہ یہ کتنی زبردست طاقت ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ جب میں فٹ بال کو زور سے ہٹ لگاتا ہوں تو فٹ بال ایک گول سے دوسرے گول تک چلا جاتا ہے؟

آصف: آپ یوں تصور کریں کہ یہ طاقت آپ کے دونوں ہاتھوں میں آجائے اور آپ زمین کو اس طاقت سے دبائیں تو وہ چھوٹی ہو کر آپ کے فٹ بال کے برابر ہو جائے گی۔

دوست: اوہ! اس سے تو مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ طاقت بہت زبردست ہے گویا یہ طاقت خدا تعالیٰ کی **مالکیت** کا اظہار کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر یہ طاقت نہ ہوتی تو نہ تو ایٹم کا مرکز قائم رہ سکتا اور نہ ہی پھر یہ کائنات ہوتی!

آصف: یقیناً آپ نے صحیح کہا ہے نہ کائنات ہوتی اور نہ ہی انسان کا وجود!

دوست: میں سوچ رہا ہوں کیا ان چار طاقتوں کا ذکر ایک رنگ میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں نہیں کیا۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار بنیادی صفات یعنی رب العالمین، الرحمن، الرحیم اور مالک یوم الدین کا ذکر فرمایا ہے۔

آصف: آپ نے ایک قابل غور نکتہ بیان کیا ہے۔ قرآن پاک کے مطالب بہت گہرے ہیں۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ المنار کے اہل علم قارئین اس بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

دوست: قبل اس کے کہ آپ بھول جائیں، یہ بھی بتا دیں کہ اس طاقت کا اظہار کس ذرہ سے ہوتا ہے؟

آصف: ذروں کو میں بھولنے والا نہیں۔ ذرہ گلوآن (Gluon) اس طاقت کی نمائندگی کرتا ہے۔

دوست: کیا سائنس دان اس بارے میں غور کر رہے ہیں کہ ان چاروں طاقتوں کا باہمی اجماع ہونا چاہیئے۔

آصف: یقیناً اس پر ساری دنیا میں بڑی تحقیق ہو رہی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ تخلیق کائنات کے وقت چاروں طاقتیں ایک تھیں۔ اور بالآخر یہ چار طاقتیں ایک قوت واحدہ میں منتج ہو جائیں گی اور یوں یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عملی ثبوت مہیا کریں گی۔ اسے سائنسدان یونیفائڈ فیلڈ تھیوری (Unified Field Theory) کہتے ہیں۔

دوست: کیوں نہ میں آپ کو بتاؤں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے جو پیغام بین الاقوامی سائنسی ادارے کا نام عبدالسلام سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس رکھنے کی تقریب میں دیا اس میں آپ نے فرمایا: ”میں یقین رکھتا ہوں کہ یونیفائڈ فیلڈ تھیوری، خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدے سے تعلق اور ایمان کی جڑ سے پھوٹی تھی کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ ہر چیز خدا تعالیٰ سے شروع ہوتی ہے اور اسی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ یقیناً اسی عقیدہ نے انہیں تقویت دی کہ وہ سائنسی اعتبار سے یہ ثابت کر سکے کہ یونیفائڈ فیلڈ تھیوری کے تحت اس کی کچھ بنیادی طاقتیں ہیں جو موجودات میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔

(کتاب ”عالمی شہرت یافتہ سائنسدان عبدالسلام“ صفحہ ۱۶۱)

آصف: ایسے عمدہ حوالے کیلئے جزاک اللہ احسن الجزاء۔

روک دیجئے!

پڑھتے ہیں کیوں نماز انہیں روک دیجئے
اللہ سے ساز باز انہیں روک دیجئے
دن رات بھیجتے ہیں محمدؐ پہ کیوں درود
ہے اس میں کوئی راز انہیں روک دیجئے
U.N.O میں کیوں سناتے ہیں قرآں کی آیتیں
حق پر ہے ان کو ناز انہیں روک دیجئے
دنیا سے واسطہ نہ سیاست سے ہے غرض
ہیں کتنے بے نیاز انہیں روک دیجئے
پھیلا رہے ہیں چار طرف انبیاء کا نُور
آتے نہیں ہیں باز انہیں روک دیجئے
تنویرؔ کی دعاؤں سے تھرّا گیا فلک
اُف اُف یہ سوز و ساز انہیں روک دیجئے

(شیخ روشن دین تنویر)

ہرن کا بچہ

ایک دفعہ جنگل سے گزرتے ہوئے سیّد عزیز اللہ شاہ صاحب نے ایک ہرن کا دودھ پیتا بچہ دیکھا جو اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا اور بھوکا تھا۔ آپ نے سامان میں سے دودھ نکال کر رومال بھگویا اور وہیں بیٹھ کر اسے اس طریق پر دودھ پلانے لگے۔ مغرب کا وقت ہو گیا، عملے میں سے کسی نے کہا کہ گھر کی مسافت بہت ہے جنگلی راستے سے گھوڑے بمشکل چلیں گے، اس بچے کو یا تو ساتھ لے چلیں یا چھوڑ دیں۔ انہوں نے کہا ایسا ظلم میں نہیں کروں گا۔ سیر ہو کر یہ دودھ پی لے تو اطمینان ہو اور بہت ممکن ہے کہ اس کی ماں اسے تلاش کرتی ہوئی ادھر آنکلے۔ میں اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کے لئے دعا کر رہا ہوں۔ ابھی پندرہ بیس منٹ نہ گزرے ہوں گے کہ ہرنی چوکڑی بھرتی ہوئی ادھر آئی اور دُور دُور سے اپنے بچے کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ سیّد عزیز اللہ شاہ صاحب نے الحمدللہ پڑھا، اسے چھوڑ دیا اور روانہ ہو گئے۔

دیر سے گھر پہنچنے پر اہلیہ کے پوچھنے پر کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر کسقدر مہربان ہے کہ اس نے اس ننھے جانور کی بھوک کی تسکین کے لئے مجھے ذریعہ بنایا اور بچوں کو نصیحت کی کہ ایسے جانوروں پر کبھی ظلم نہیں کرنا چاہئے اور ان کو کھیل کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ یہ بے زبان مخلوق بھی فریاد کرتی ہے۔ ان بے زبانوں سے دعائیں لیا کرو۔ ان سے پیار کرو، انہیں دانہ پانی کھلاؤ۔

(سیرت حضرت اُمّ طاہر صفحہ 56)

جلسہ سالانہ برطانیہ کے دوسرے روز 31 اگست بروز ہفتہ جلسہ سالانہ کے دفتر کی مارکی میں تعلیم الاسلام کالج کے سابق طلباء (برطانیہ کے طلباء و دیگر ممالک سے تشریف لانے والے مہمان طلباء) کی ایک پُرلطف مجلس منعقد ہو رہی ہے جس میں کالج کے سابق اساتذہ کرام بھی شامل ہوں گے۔ اس مجلس میں ضرور تشریف لائیں اور کھانے میں شامل ہوں۔ اجلاس نماز ظہر و عصر کے فوراً بعد کھانے کے وقفہ میں منعقد ہوگا۔ اجلاس نمازِ ظہر و عصر کے فوراً بعد کھانے کے وقفے میں منعقد ہوگا۔ دیگر سابق طلبہ کو بھی اس بات سے آگاہ فرمائیں۔ شکریہ۔

مکرم منور احمد نمی مرحوم

(ڈاکٹر پرویز پروازی)

ابھی کچھ دن ہوئے میں نے اپنے کالج کے ڈی بیٹر ساتھیوں میں منور احمد نمی کی اچانک وفات کی اُڑتی اُڑتی خبر سنی مگر اس کے کسی عزیز رشتہ دار تعلق والے کا فون نمبر معلوم نہیں تھا کہ تصدیق کر سکتا۔ آج اس کے چھوٹے بھائی اور ہمارے چہیتے شاگرد عزیزی جاوید احمد نے لیڈز انگلستان سے ای میل پر اس کی وفات کی خبر بھیجی۔ کالج کے ہمعصر دوست کی وفات کی خبر بڑی جانکاہ ہوتی ہے مگر موت سے کسی کو مفر نہیں۔ جانا تو ہر ایک کو ہے۔ نمی بھی چلا گیا۔ وہ ہمارا بڑا مخلص دوست اور ساتھی تھا۔ کالج یونین میں ہم اکثر ڈی بیٹس میں شریک رہتے۔ کبھی حق میں کبھی خلاف۔ روسٹرم پر خوب نوک جھونک رہتی مگر عام زندگی میں دوستی قائم رہتی۔

نمی سلسلہ کے مشہور استاد ماسٹر علی محمد صاحب بی اے بی ٹی کا بیٹا اور ہمارے دوست عبدالسلام اختر کا چھوٹا بھائی تھا کالج کی ہم نشینی کے علاوہ ہمارا محلہ دار بھی تھا۔ تعلیم میں ہم سے دو سال جونیئر تھا مگر یونین کے مقررین میں ہم باہم ساتھی تھے کئی بار باہر کے کالجوں میں ہم بہ طور ٹیم شریک ہوئے۔ یہ تو یاد نہیں کہ نمی کے ساتھ ہماری کوئی ٹرافی مشترکہ تھی یا نہیں مگر ہم کالج یونین کی ٹیم ضرور تھے۔ کالج کے اکثر سالانہ مباحثوں میں ہم دونوں میں سے ایک قائد حزب اختلاف ہوتا اور دوسرا قائد ایوان۔ اپنے پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب کسی مقرر کو پوری تیاری اور ری ہرسل کے بغیر کبھی سٹیج پر نہیں آنے دیتے تھے اس لئے سالانہ مباحثوں کے دنوں میں ہم دونوں کی جان ضیق میں ہوتی تھی مگر خاں صاحب کوئی رو رعایت روا نہ رکھتے جب تک ان کی تسلی نہ ہو جاتی کسی کو سٹیج پر نہ آنے دیتے۔ اب نمی کی سناؤنی سنی ہے تو کالج کے ڈی بیٹر دوست یاد آنے لگے ہیں۔ خالد بشیر، مولوی عبدالغفور صاحب کا بیٹا عبدالسمیع، مولوی عبد السلام عمر صاحب کا بیٹا حفیظ عمر، غیر از جماعت دوست عبدالرشید قریشی جو بعد کو نوابزادہ نصر اللہ خاں کی پارٹی کا بڑا عہدیدار رہا مگر کالج سے تعلق استوار رکھا۔ انگریزی ڈی بیٹرز میں عبداللہ ابوبکر، سعید عبداللہ، سید مشہود احمد شاہ اور اپنے مرحوم کرنل محی الدین نمایاں تھے۔ ان میں سے کئی دوست گذر گئے ہیں مگر تازہ ترین خبر نمی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔ ہمارا کالج کھیلوں کے علاوہ یونین کی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی جانا پہچانا کالج تھا بلکہ اس دور کے جو ڈی بیٹرز ابھی تک حیات ہیں وہ ہمارے کالج کے مباحثوں اور دعوتوں کو یاد کیا کرتے ہیں۔

بات منور احمد نمی کی تھی۔ نمی سلسلہ کے مشہور و معروف خاندان کا فرد تھا۔ بی ٹی صاحب تو سلسلہ میں بی ٹی صاحب کے نام سے ہی معروف ہوئے۔ عبدالسلام اختر جماعت کے نغز گو شعرا میں تھے۔ واقف زندگی تھے شعر گوئی کو بھی آپ نے سلسلہ کے علم کلام کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ تعلیم سے ان کا انتظامی رابطہ رہا نائب ناظر تعلیم رہے گھٹیالیاں کالج کے پرنسپل بھی رہے مگر ان کی پہچان شاعر سلسلہ کی ہی رہی۔ ان سے چھوٹے منصور بی ٹی بھی شاعر تھے مگر ان کی شاعری اپنے حلقوں سے باہر نہ نکلی۔ ہم نے البتہ منصور بی ٹی کی کچھ نظمیں سنی ہیں بڑے پختہ گو تھے۔ اب منصور کا صاحبزادہ عزیزم طارق احمد سلسلہ احمدیہ کا پہلا پہلا لارڈ ہے۔ لارڈ احمد آف وملیڈن! قادیان کا یہ خاندان ہاؤس آف لارڈز تک پہنچا! ماشاءاللہ!

نمی ہمارا ہم عصر رہا مگر اس کے تین چھوٹے بھائی جاوید، حامد اور پرویز ہمارے شاگرد ہوئے۔ جاوید نے ہی نمی کی سناؤنی سنائی ورنہ ہم بے خبر ہی رہتے اور ایک دوست کے ذکر خیر سے محروم۔

منور احمد نمی کی مسکراہٹ بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہونٹ مسکراتے ہوئے ہونٹ تھے۔ مدتوں بعد ہم لندن کے جلسہ سالانہ پر ملے تو اس کی اسی مسکراہٹ نے استقبال کیا۔ ہمارے ساتھ کالج کے زمانہ کا دوست اور ساتھی سید الیاس بشیر تھا۔ میں نے کہا پہچانو کہنے لگا نمی ہے اور کون ہے ایسے مسکراتے ہونٹ اور کس کے ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ الیاس بشیر اس سے کوئی چالیس برس کے بعد ملا تھا۔ کالج سے نکلنے کے بعد منور جلد ہی انگلستان چلا آیا اسے ایک ہی لو لگی تھی کہ انگلستان جانا ہے اور شیکسپیئر کے دیس میں جانا ہے۔ آخر جا کر ہی رہا اور اب تو شاید وہیں کہیں ہمیشہ کے لئے سو بھی گیا ہے۔ شعر کا ذوق تو تھا مگر شعر کہتا تھا یا نہیں ہمیں اس کا پتہ نہیں کیونکہ اس سلسلہ میں ہم نے اس خاندان کے علی محمد سرور اور عبدالسلام اختر کو ہی بس جانا ہے۔ ہاں اس کے خسر اپنے عبدالرحمٰن شاکر تو انجمن کے ان گنے چنے کارکنوں میں تھے جنہیں لائبریری سے عشق ہوتا ہے نہایت صاحبِ ذوق آدمی تھے دفتر سے اٹھتے تو لائبریری کا رخ کرتے ہم سوچا کرتے تھے ماشاءاللہ کثیر العیال آدمی ہیں کتابیں نکلوانے کا شوق ہوگا پڑھنے کی فرصت کہاں نکال پاتے ہوں گے؟ نہیں جناب شاکر صاحب کتاب پڑھتے نہیں تھے چاٹتے تھے۔ شاکر صاحب نے اپنی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ میرا خیال ہے منور نمی کی بیوی شاید بی اے بی ٹی تھیں اور شاکر صاحب کی ایک بیٹی ربقہ تو شاید لیکچرار تھیں۔ اب اس کے بزرگوں میں ہمارا جاننے والا کوئی نہیں رہا نہ اس کے اپنے خاندان میں نہ اس کے سسرال کے خاندان میں مگر جماعت احمدیہ کی روایتیں تو اس خاندان میں ماشاءاللہ پختہ ہیں۔ لارڈ طارق احمد ایم ٹی اے پر باقاعدہ پروگرام کرتے ہیں اللہم زد فزد۔ ہمیں منور احمد نمی کی آل اولاد کا کچھ علم نہیں اللہ تعالیٰ ان کا حافظ و ناصر ہو اور انہیں بھی اپنے بزرگوں کے اسوہ پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

14 اگست کی مناسبت سے

(رشید قیصرانی)

تری طلب، تری خوشبو، ترا نمو بولے
مرے وطن مری رگ رگ میں صرف تُو بولے
نَفَس نَفَس تُو مرے سانس کی گواہی دے
ترے بدن میں مرا دِل، مرا لہو بولے
صدا کی لہریں ہم اک دوسرے کے گِرد بُنیں
میں قریہ قریہ پکاروں، تُو کُو بکُو بولے
میں حرف حرف سجا لوں صحیفۂ دِل پر
تُو برگ برگ سرِ شاخِ آرزو بولے
وہ دن بھی آئے کہ لکھوں میں شش جہت ترا نام
ترا علَم، تری سج دھج بھی چار سُو بولے
وہ دن بھی آئے کہ مہکے ترا گلاب شباب
چمن چمن ترا اندازِ رنگ و بُو بولے
وہ دن بھی آئے کہ لکھا ترا امر ٹھہرے
جو تُو کہے وہی دنیا بھی ہُو بہو بولے
نشانِ حُرمت و تقدیسِ حرف جب تجھ سے
کوئی بھی بولنا چاہے تو با وضو بولے
مرے وطن سرِ مینارِ نُور تا بہ ابد
تُو چاند بن کے اندھیروں کے رُو برو بولے
خموش کیوں ہے یہ مسکن قلندروں کا رشید
کوئی تو وجد میں آئے، کوئی تو ہُو بولے